ذ

ذا

ذَا۔ یہ ۔ اس کا مونث ذِہٗ ۔ ذِہٖ ۔ ذِھِیْ۔ تَا ۔ تِیْ وغیرہ ھیں ۔ اس کا تثنیہ (دو کے لئے) ذَانِ اور ذَیْنِ ۔ (مونث کے لئے تَانِ ۔ تَیْنِ) آتا ھے ۔ اور جمع اُولَاءِ (دیکھئے عنوان اولاء) اس سے پہلے اکثر ھَا سلا ھوا ھوتا ھے ۔ جیسے ھٰذَا (اس کا مونث ھٰذِہٖ آتا ھے) یہ اشارہ قریب کےلئے ھے ۔ اشارہ بعید کے لئے ذَالِکَ (مذکر) تِلْکَ (مونث)۔ اس کے آخر میں مخاطب کے مطابق ضمیر بدلتی رھتی ھے ۔ مثلاً ھمارا مخاطب ایک مرد ھے اور ھم اُس سے کہ رھے ھیں کہ اُس چیز کو دیکھو۔ تو ھم ذَالِکَ کہینگے ۔ اور اگر مخاطب دو مرد ھوں تو ذَالِکُمَا کہینگے۔ بہت سے ھوں تو ذَالِکُمْ۔ اسی طرح اگر مخاطب ایک عورت ھو تو ذَالِکِ کہینگے ۔ اور بہت سی عورتیں ھوں تو ذَالِکُنَّ کہینگے ۔

ذَا کے مختلف استعمال یہ ھیں ۔ ذَاکَ۔ ذَانِکَ ۔ (ھَاتَاکَ ۔ ھَاتِیْکَ)۔ جمع کے لئے اُولَاکَ یا اُوْلٰئِکَ ۔کبھی ذَاکَ کے درمیان ل ۔ لاکر ، ذَالِکَ (مونث کے لئے تِلْکَ) بنا لیتے ھیں ۔ اس سے پہلے کاف آنے سے کَذَالِکَ ھو جاتا ھے ۔ اس کے استعمال کی مثالیں یہ ھیں ۔

(۱) مَنْ ذَاالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ ......(٢/٢٥٥)۔ وہ کون ھے جو اس کے ھاں کسی کے ساتھ کھڑا ھوسکے ۔

(۲) یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ....(٢/١٢٥)۔ تجھ سے پوچھتے ھیں کہ وہ کیا ھے جسے کھلا رکھا جائے ۔

(۳) اِنْ ھٰذَانِ لَسَاحِرَانِ ...(٢٠/٦٣)۔ یہ تو بس دو جادوگر ھیں ۔

(۴) ذَالِکَ الْکِتَابُ ...(٢/٢)۔ یہ وہ کتاب ھے... تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ (٢/١٣٤) یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی ۔

(ہ) فَذَانِکَ بُرْھَانٰنِ . . . (۲۸/۳۲) ۔ یہ دونوں روشن دلیلیں ھیں۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے ذَالِکَ اشارہ بعید (وہ) ھے لیکن یہ اشارہ قریب (یہ) کے لئے بھی آتا ھے۔ قرآن کریم میں ذَالِکَ اشارہ قریب (یہ) کے لئے زیادہ اور اشارہ بعید (وہ) کے لئے کم آیا ھے ۔ مثلاً سورۃ روم میں فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ کے بعد ھے ذَالِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (۳۰/۳۰) ۔ یہی دینِ قیم ھے ۔ یا مثلاً سورۃ بنی اسرائیل میں ماپ تول کے متعلق ضروری ھدایت کے بعد فرمایا ذَالِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (۱۷/۳۵) ''یہ بہتر اور انجام کار بہت خوبی کی بات ھے'' ۔ ان مقامات میں ذَالِکَ اشارہ قریب کے لئے ھے ۔

اس کے برعکس سورۃ کہف میں جہاں حضرت موسیٰ[ؑ] کے ایک سفر کا ذکر ھے وھاں (اس مقام پر جہاں آپ کا ساتھی مچھلی پیچھے بھول آیا تھا) کہا کہ ذَالِکَ مَا کُنَّا نَبْغِ (۱۸/۶۴) ''وھی توجگہ تھی جسکی ھمیں تلاش تھی'' ۔ یہاں ذَالِکَ اشارہ بعید کے لئے ھے ۔

راغب نے کہا ھے کہ ذَالِکَ آتا توھے بعید کے لئے لیکن اس سے بُعدِ مسافت ھی مراد نہیں ۔ جو شے بلندیٔ مرتبت کی وجہ سے اونچے مقام پر ھو اور یوں دور ھو ، اس کے لئے بھی ذَالِکَ آتا ھے خواہ وہ چیز ویسے قریب ھی رکھی ھو ۔ اسی اعتبار سے ذَالِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (۲/۲) کے معنے ھونگے یہ کتاب جو بڑی باعظمت اور رفیعُ الشان ھے

ذَالْکِفْل

قرآن کریم نے آپ کا نام انبیاء کرام[ؑ] کے سلسلہ میں لیا ھے (۲۱/۸۵ و ۳۸/۴۸) لیکن مزید تعارف نہیں کرایا ۔ قیاس یہ ھے کہ آپ حزقی ایل نبی ھیں جن کا صحیفہ تورات میں موجود ھے ۔ (نیز دیکھئے عنوان ک ۔ ف ۔ ل)

ذَالنُّوْن

حضرت یونس[ؑ] کا لقب ھے (۲۱/۸۷)۔ تفصیل کےلئے دیکھئے عنوان ''یونس'' اور ''نون'' ۔

ذ أ ب

اَلذِّئْبُ ۔ بھیڑیا (۱۲/۱۳) ۔ اَلذَّاْبُ ۔ ڈرانا۔ مذمت کرنا ۔ سخت آواز*۔ بدزبانی ۔ ذَاَبَ الرَّجُلُ ۔ آدمی زور سے چیخا**۔ ابن فارس نے کہا ھے

* تاج ۔ **محیط ۔

کہ اس کے بنیادی معنے کم ٹھہرنا ، بے قراری ھیں ۔ نیز کسی چیز کی ایسی حرکت جو ایک سمت سے نہ ھو۔ مثلاً تَذَاْبَتِ الرِّیْحُ کے معنی ھیں ھوا ھر طرف سے آئی ۔ بھیڑئیے کو ذِئْبٌ اسی لئے کہتے ھیں کہ وہ کبھی ایک طرف سے آتا ھے کبھی دوسری طرف سے ۔

ذ أ م

ذَاَمَہٗ ۔ یَذْاَمُہٗ ۔ کسی کو حقیر و مذموم گرداننا ۔ نیز اسکے معنے عیب لگانے ، رسوا کرنے ، کے آتے ھیں ۔ کسی کو جھڑک کر نکال دینے کے بھی* ۔ راغب نے مَذْؤُوْم بمعنی مَذْمُوْم لکھا ھے ۔

آذْاَمَہٗ ۔ اسے مرعوب و خوفزدہ کر دیا* ۔

قرآن کریم میں ابلیس کے متعلق ھے ۔ قَالَ اخْرُجْ مِنْھَا مَذْءُوْمًا مَدْحُوْرًا ($\frac{۷}{۱۸}$) ۔ اسکے معنے ذلیل اور حقیر ھی کے ھیں ۔ یا جھڑک کر نکالے ھوئے کے ۔

ذ ب ب

ذُبَابٌ ۔ مکھیاں ۔ واحد ذُبَابَۃٌ ۔ صاحب محیط نے جاحظ کے حوالے سے لکھا ھے کہ (عام مکھیوں کی جملہ اقسام کے علاوہ) عربوں کے ھاں ذُبَابٌ کا اطلاق ھر قسم کی بھڑوں، شہد کی مکھیوں اور مچھروں پر بھی ھوتا ھے** ۔ قرآن کریم میں ھے ۔ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا ($\frac{۲۲}{۷۳}$) ۔ ''وہ مکھی بھی نہیں پیدا کر سکینگے'' ۔ مکھیوں کو ذُبَابٌ اس لئے کہا جاتا ھے کہ انہیں ھٹایا اور دور کیا جاتا ھے ۔ یا اس وجہ سے کہ انہیں ایک جگہ قرار نہیں ھوتا ۔ اس مادہ میں یہ دونوں مفہوم پائے جاتے ھیں ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی اضطراب و حرکت کے بھی ھیں ۔ راغب نے لکھا ھے کہ اَلذَّبْذَبَۃُ معلّق شے کے ھلنے کی آواز کو کہتے ھیں ۔ پھر، یہ لفظ ھر حرکت و اضطراب (تردداور ڈھلمل یقینی) کے لئے آتا ھے*** ۔ بَعِیْرٌ ذَابٌّ ۔ اُس اونٹ کو کہتے ھیں جو ایک جگہ پر کھڑا نہ رھے**** ۔

ذَبْذَبَۃٌ ۔ اگرچہ یہ لفظ ذ ب ذ ب کے تحت آنا چاھئے لیکن بعض اھل لغت نے اسے ذ ب ب کے تحت لکھا ھے ۔ ھر دو میں اشتراک معنی کی وجہ سے ھم بھی اسے یہاں (ذ ب ب کے تحت) درج کر رھے ھیں ۔ قرآن کریم میں منافقین کے متعلق کہا ھے مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذَالِکَ ($\frac{۴}{۱۴۳}$) اور

*تاج و محیط ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****تاج ۔

اسکی تشریح یہ کہکر کر دی ہے۔ لَا اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ (۴/۱۴۳)۔ نہ یکسو ہو کر ادھر کے اور نہ ہی یکسو ہو کر اُدھر کے۔ انہی کے متعلق ہے مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ (۲۲/۱۱)۔ جو کنارے پر کھڑے ہو کر (Sitting on the Fence) قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ ادھر فائدہ دیکھا تو ادھر جھک گئے۔ اُدھر دیکھا تو اُدھر جھک گئے۔ مکھی کی طرح، کہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ جہاں وہ بیٹھی ہے اسکے بعد اڑ کر کہاں جا بیٹھیگی۔ یہ کیفیت، ایمان اور یقین کی یکسر نقیض ہے۔ ایمان کی کیفیت تو یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (۴۱/۳۰)۔ ایک مرتبہ خدا کی ربوبیت کا اقرار کر لیا تو پھر اس پر جم کر بیٹھ گئے۔ ایمان اور استقامت، یہ ہے مومن کا شعار۔ برعکس منافق کے جو موقع پرست (Opportunist) ہوتا ہے۔

ذ ب ح

ذَبَحَ ۔ یَذْبَحُ ۔ اندر کی طرف سے سر اور گردن کے جوڑ سے حلق کاٹ دینا ۔ چیر دینا ۔ پھاڑ دینا ۔ شق کر دینا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ ذَبَحَتْہُ الْعَبْرَۃُ۔ آنسوؤں نے اسکا گلا گھونٹ دیا ۔ اَلتَّذْبِیْحُ ۔ بہت زیادہ ذبح کرنا ۔ سر کو اسقدر جھکا دینا کہ وہ کمر سے نیچا ہو جائے ۔ اَلذِّبْحُ ۔ وہ چیز جو ذبح کی جائے*۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ قوم فرعون یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ (۲/۴۹ و دیگر مقامات)۔ "تمہارے ابناء کو ذبح کر دیتے تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے"۔ عام طور پر اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو لڑکے پیدا ہوں انہیں پیدا ہوتے ہی مار دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے ۔ سوال یہ ہے کہ یُذَبِّحُوْنَ سے مراد سچ مچ ذبح کر دینا ہے یا اسکے معنے کچھ اور بھی ہیں ۔ سورۃ اعراف میں یُذَبِّحُوْنَ کی جگہ یُقَتِّلُوْنَ آیا ہے (۷/۱۴۱)۔ یعنے وہ تمہارے ابناء کو قتل کر ڈالتے تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے اس باب میں ذَبْحٌ اور قَتْلٌ کو مرادف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قَتْلٌ کے معنے کیا ہیں ۔ اس لفظ کے متعلق عنوان ق ۔ ت ۔ ل میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے ۔ وہاں آپ دیکھینگے کہ اسکے

* تاج ۔

معنے صرف مار ڈالنا نہیں بلکہ اسکے معنے ذلیل وخوار کرنا۔ کسی کو کمزور اور غیر مؤثر کر دینا ۔ ایسا بنا دینا کہ اسکی موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہو۔ کسی کو حقیر کر دینا، بھی ھیں ۔ نیز اسکے معنے کسی کو علم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ھیں ۔ (ان معانی کی اسناد ق ـ ت ـ ل کے عنوان میں ملینگی) ۔ قرائن سے مترشح ھوتا ھے کہ بنی اسرائیل کے معاملہ میں ذَبْح یا قتْل سے مراد سچ مچ قتل کر دینا نہیں بلکہ انہیں ذلیل و حقیر کرنا اور کمزور و غیر مؤثر بنا دینا ھیں ۔ سچ مچ قتل کر دینے کے خلاف حسب ذیل قرائن ھیں ۔

(۱) یہ ظاھر ھے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل کی قوم کی تعداد بہت بڑی تھی ۔ اگر کسی قوم کی حالت یہ ھوجائے کہ اسکے تمام لڑکے مار دئیے جائیں اور صرف لڑکیاں زندہ رکھی جائیں تو کچھ وقت کے بعد وہ قوم ھی ختم ھو جائیگی* ۔

(۲) حضرت موسیٰؑ کے بڑے بھائی (حضرت ھارونؑ) بھی زندہ موجود تھے ۔ اور حضرت موسیٰؑ بھی پیدا ھوتے ھی مار نہیں ڈالے گئے تھے ۔ اس سے بھی ظاھر ھے کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ھوتے ھی مار نہیں دیا کرتے تھے ۔

(۳) سورۃ یونس میں ھے کہ فَمَا اٰمَنَ لِمُوْسٰی اِلَّا ذُرِّیَّۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ (۱۰/۸۳) ''موسیٰ پر اسکی قوم کی ذُرِّیَّت ایمان لائی'' ۔ ذریت نئی پود (یا نو جوانوں) کو کہتے ھیں ۔ (دیکھئے ذ ـ ر ـ ر)۔ اگر بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ھوتے ھی مار دیا کرتے تو یہ ذریت موجود ھی نہ ھوتی ۔ (قوم کے نو جوانوں کے ایمان لانے کی وجہ سمجھنے کے لئے عنوان ذ ـ ر ـ ر ـ دیکھئے) ۔

(۴) جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس آئے ھیں تو اسنے کہا کہ ھم نے تیری پرورش کی اور تجھ پر اسقدر احسانات کئے اور تو ان احسانات کا یہ بدلہ دے رھا ھے ۔ تو اسکے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ وَتِلْکَ نِعْمَۃٌ تَمُنُّھَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۲۶/۲۲) ۔ ''یہ وہ نعمت ھے جسے تو مجھ پر جتاتا ھے کہ تونے بنی اسرائیل کو غلام (محکوم) بنا رکھا ھے'' ۔ آپ دیکھئے ۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے خلاف جو الزام عائد کیا ھے وہ بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کا ھے ۔ اگر وہ ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کا مجرم بھی ھوتا تو آپ سب سے پہلے اسکا ذکر

* بعض تفاسیر میں ھے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے نوے ھزار بچوں کو قتل کیا تھا ۔

کرتے کیونکہ یہ جرم، قوم کو غلام (محکوم) بنانے سے کہیں زیادہ سنگین تھا ۔ لیکن آپ سارے قرآن کریم میں دیکھ جائیے۔ حضرت موسیٰ ؑ نے کسی جگہ بھی فرعون اور اسکی قوم کو اس جرم سے مطعون نہیں کیا ۔

ان شواھد سے ظاھر ھے کہ فرعون اور اسکی قوم بنی اسرائیل کے بچوں کو سچ مچ ذبح نہیں کیا کرتے تھے ۔ یعنے انہیں مار نہیں ڈالا کرتے تھے۔ کہا جائیگا کہ اگر یہ بات نہیں تھی تو پھر حضرت موسیٰ ؑ کی والدہ نے (خدا کے حکم سے) حضرت موسیٰ ؑ کو صندوق میں ڈالکر دریا میں کیوں بہا دیا تھا ۔ اِس سے ظاھر ھے کہ اسوقت بنی اسرائیل کے بچوں کو پیدا ھوتے ھی مار دیا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ ؑ کو محفوظ رکھنے کیلئے یہ تدبیر کی تھی ۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ خود قرآن کریم میں اسکی تصریح موجود ھے کہ فرعون نے یہ حکم (کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیا جائے*) اُسوقت دیا تھا جب حضرت موسیٰ ؑ اپنی دعوتِ انقلاب لیکر آئے ھیں ۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں ھے کہ حضرت موسیٰ ؑ کی انقلابی دعوت کا عالمگیر اثر دیکھکر فرعون کے امیروں اور وزیروں نے فرعون سے کہا کہ انکے خلاف کوئی سخت اقدام کیوں نہیں کیا جاتا؟ انہیں اسطرح کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ھے کہ یہ جو جی میں آئے کرتے جائیں ؟ اسکے جواب میں فرعون نے کہا کہ نہیں ! میرے سامنے ایک تجویز ھے ۔ اور وہ یہ کہ سَنُقَتِّلُ اَبْنَاءَ ھُمْ وَنَسْتَحْیِی نِسَاءَ ھُمْ (۷/۱۲۷)۔ ”عنقریب ھم ان کے لڑکوں کو قتل کر دینگے اور انکی عورتوں کو زندہ رکھینگے“۔ اس سے صاف ظاھر ھے کہ یہ تدبیر اسوقت عمل میں لائی گئی تھی جب حضرت موسیٰ ؑ کی دعوت پھیلی ھے ۔ حضرت موسیٰ ؑ کی پیدائش کے وقت یہ حکم موجود نہیں تھا ۔ سورۃ المومن میں اسے اور بھی واضح کر دیا گیا ھے ۔ وھاں کہا گیا ھے کہ جب حضرت موسیٰ ؑ فرعون کے پاس دعوت لیکر گئے تو اسنے کہا کہ اُقْتُلُوْا اَبْنَاءَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مَعَہٗ وَ اسْتَحْیُوْا نِسَاءَ ھُمْ (۴۰/۲۵)۔ ”جو لوگ موسیٰ ؑ پر ایمان لائیں انکے بیٹوں کو قتل کر دو اور انکی عورتوں کو زندہ رکھو“ ۔ اس سے نہ صرف یہی واضح ھے کہ یہ حکم دعوت حضرت موسیٰ ؑ کے زمانہ میں دیا گیا تھا بلکہ یہ بھی کہ یہ

*جبتک ان الفاظ کا صحیح مفہوم آگے جا کر واضح نہیں ھو جاتا ھم یہی الفاظ لکھتے جائینگے ۔ یعنے بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کرنے کا حکم وغیرہ ۔

حکم تمام بنی اسرائیل کیلئے نہیں تھا ۔ صرف ان کے متعلق تھا جو حضرت موسٰیؑ پر ایمان لائے تھے* ۔

ان شواہد سے واضح ہے کہ حضرت موسٰیؑ کی پیدائش کے وقت یہ حکم نافذ نہیں تھا ۔ لہذا جب یہ حکم ہی نہ تھا تو یہ سمجھنا صحیح نہیں ۔ کہ حضرت موسٰیؑ کو اسلئے دریا میں بہا دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس تدبیر سے زندہ رکھنا چاہتا تھا ۔

حضرت موسٰیؑ کو دریا میں کیوں بہا دیا گیا تھا ۔ اسکا جواب خود قرآن کریم نے دیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل مصر میں حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں داخل ہوئے تھے۔ اور حضرت یوسفؑ کو جو وقار مصر میں حاصل تھا اس پر قرآن کریم شاہد ہے ۔ مملکت کے خزانے کی چابیاں ان کے ہاتھ میں تھیں ۔ اس قوم کا وقار حضرت یوسفؑ کے بعد بھی کچھ عرصہ تک باقی رہا ہوگا۔ لیکن اسکے بعد حاکم قوم نے بنی اسرائیل کو محکوم قوم کا درجہ دیدیا ہوگا۔ اگرچہ آج بھی دنیا میں محکوم قوموں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن اُس زمانے میں تو محکوم قوم کی حیثیت غلاموں کی سی ہوتی تھی۔ نہ اُنکے بچوں کیلئے تعلیم و تربیت کے کوئی مواقع ہوتے تھے، نہ بڑوں کیلئے حکومت کے کاروبار میں عمل دخل کی کوئی صورت۔ مشیت کے پروگرام کے مطابق حضرت موسٰیؑ کو فرعون کے ساتھ ٹکر لینے کیلئے پیدا کیا گیا تھا ۔ اس مقصد کیلئے ضروری تھا کہ انکی تعلیم و تربیت بھی اعلٰی درجہ کی ہوتی اور انہیں رموز مملکت اور غوامض سیاست سمجھنے کے بھی مواقع حاصل ہوتے ۔ اس مقصد کیلئے تجویز یہ کیا گیا کہ انکی پرورش خود فرعون کے محلات میں ہو اور انکا ابتدائی زمانہ فرعون کے متبنٰی کی حیثیت سے گزرے۔ یہ تھا وہ مقصد جس کیلئے انہیں دریا میں بہا کر فرعون کے محلات تک پہنچایا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ یہ اس لئے کیا گیا تھا لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (۲۰/۳۹) ''تا کہ تیری تربیت ہماری زیر نگرانی ہو''۔ یعنے اس سے مقصد حسن تربیت تھا (جس پر بنی اسرائیل کے بچوں کے دروازے بند تھے)۔ اور یہ اس پروگرام کی ایک کڑی تھی جسکے مطابق حضرت موسٰیؑ کو اس مہم کیلئے تیار کیا جا رہا تھا ۔ چنانچہ اس سے ذرا آگے ہے ۔ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یٰمُوْسٰی (۲۰/۴۰)۔ ''اسطرح آہستہ آہستہ تم، اے موسٰی، ہمارے پیمانے پر پورے اتر آئے''۔

*یہ بات آگےچلکر بتائی جائیگی کہ جو لوگ حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے انکے خلاف تو فرعون نے کچھ نہیں کیا ۔ انکے بیٹوں کو قتل کرنے کا حکم کیوں دیا؟ اُن بچوں کا کیا قصور تھا؟ ۔

سورۃ القصص میں البتہ یہ مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی ماں سے کہا گیا کہ اَرْضِعِیْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ (۲۸/۷) ۔ ''تو اس بچہ کو دودھ پلاتی رہ ۔ اور جب تجھے اسکے متعلق خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا،، ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ خوف اس بات کا تھا کہ فرعون کے لوگ بچے کو قتل کر دینگے ۔ لیکن جب قرآنی شواہد سے یہ ظاہر ہے کہ قتل ابناء کا حکم حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے زمانے کا ہے تو اس سے یہ اندازہ صحیح نہیں ہو سکتا ۔ اس خوف کا باعث کچھ اور سمجھنا ہوگا ۔ اس سے آگے فرعون کی بیوی کے متعلق کہا ہے کہ جب فرعون کے لوگوں نے صندوق پکڑلیا تو اسنے اپنے خاوند سے کہا کہ لَا تَقْتُلُوْهُ (۲۸/۹) ''اسے قتل نہ کرو،، ۔ اسے ہم متبنّٰی بنا لیتے ہیں ۔ اس سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کیا جاتا تھا ۔ لیکن یہ قیاس اس لئے صحیح نہیں کہ اس بچے کے متعلق (جسے دریا کی لہروں سے اٹھایا گیا تھا) یہ کسطرح معلوم ہو گیا کہ وہ بنی اسرائیل کی قوم کا بچہ ہے ، قوم فرعون میں سے کسی کا بچہ نہیں ۔ لہذا یہاں لَا تَقْتُلُوْهُ کے معنے قتل کرنا نہیں ہونگے بلکہ حقیر سمجھکر پھینک دینے کے ہونگے ۔ (دیکھئے عنوان ق ۔ ت ۔ ل) ۔

اسکے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَهُمْ کا صحیح مفہوم کیا ہے ۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ فیصلہ اُس زمانے کا ہے جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت عام ہورہی تھی اور فرعون اور اس کی قوم کو اس سے خطرہ لاحق ہو رہا تھا ۔ چنانچہ فرعون کے ارباب حل و عقد نے اس سے کہا تھا کہ اس فتنے کو کب تک اس طرح کھلا رہنے دیا جائیگا ۔ اس کا کچھ علاج کرنا چاہئے (۷/۱۲۷) تو اسکے جواب میں اس نے کہا تھا کہ اس کےمتعلق میں نے ایک تجویز سوچ لی ہے ۔ ہم اس پر عمل پیرا ہونگے ۔ اور وہ تجویز یہی (قتل ابناء کی) تھی ۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس تجویز کو کَیْدٌ (۴۰/۲۵) سے تعبیر کیا ہے ، جس کے معنے ہیں ایک گہری چال ۔ یہ چال کیا تھی؟ فرعون کے متعلق سورۃ قصص میں ہے کہ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸/۴) ۔ ''وہ اپنی رعایا میں پارٹیاں بناتا رہتا تھا اور ایک گروہ کو کمزور کرتا جاتا تھا''۔ اس کے بعد ہے یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ یَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ (۲۸/۴) ۔ یعنے ان کے اَبْنَآء کو ذبح کرتا تھا اور نِسَآء کو زندہ رکھتا تھا ۔ اس کی تدبیر یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو پارٹیوں میں تقسیم

کر دیا جائے تاکہ اُس قوم میں پھوٹ پڑی رہے اور وہ باھمی آویزشوں میں الجھی رہے ۔ یہ وہ چال ہے جو ہر سیاستدان حکمران قوم، قومِ محکوم کے ساتھ کرتی رہتی ہے ۔ اس کے بعد قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اِس پارٹی بازی میں وہ کرتا یہ تھا کہ قوم کا وہ طبقہ جس میں اسے جوھرِ مردانگی نظر آتے ۔ جن کے متعلق وہ سمجھتا کہ اُن کا اُبھرنا خطرناک ہے ۔ انہیں دبانا ۔ اُنہیں ہر طرح حقیر و ذلیل رکھتا ۔ اور جس طبقہ کو دیکھتا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورتوں جیسے ہیں، اُنہیں ابھار کر معزز و مقرب بنا لیتا اور ان کے ھاتھوں انہی کی قوم کا گلا گھونٹتا رہتا ۔ یہ کچھ بھی ہر ماہرِ سیاست حاکم قوم کرتی ہے۔ وہ ھمیشہ محکوم قوم کے ان افراد کو ذلیل و خوار رکھتی ہے جن میں انہیں جوھر مردانگی نظر آتے ہیں اور ان لوگوں کو جن سے کسی خطرہ کا امکان نہ ہو، آگے بڑھاتی رہتی ہے ۔ قرآن کریم نے اول الذکر طبقہ کو قوم کے آبْنَاء کہا ہے اور ثانی الذکر کو نِسَاء ۔ اور قَتْلِ آبْنَاء سے مراد ہے انہیں ذلیل و حقیر رکھنا ۔ اور اِسْتِحْيَاءِ نِسَاء سے مفہوم ہے اس دوسرے طبقہ کو ابھار کر آگے بڑھانا ۔ اس طرح وہ پوری کی پوری قومِ بنی اسرائیل کو کمزور کئے جا رہا تھا ۔

قرآن کریم کے شواھد سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ قَتْل یا ذَبْحِ آبْنَاء سے یہی مراد ہے ۔ لیکن بہر حال یہ ایک اندازہ ہے جس پر مزید غور کیا جا سکتا ہے ۔ اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ فرعون کے اس حکم کا مطلب کیا تھا کہ جو لوگ موسیٰ پر ایمان لائے ہیں ان کے آبْنَاء کو قتل کر دیا جائے ($\frac{۴۰}{۲۵}$) ۔ یعنی اس کی تدبیر یہ تھی کہ اس جماعت میں اس طرح سے پھوٹ ڈالی جائے کہ ان کی پارٹیاں بنا دی جائیں اور اس طرح ان میں جتنے لوگ ایسے ہیں جن سے خطرہ ہوسکتا ہے انہیں ایسا غیر موثر بنا دیا جائے کہ کوئی ان کی بات ہی نہ سنے (قَتْل کے یہ معنے عنوان ق-ت-ل میں دیکھئے) ۔ ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایمان تو لائیں یہ لوگ، اور حکم یہ دیا جائے کہ ان کے پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کر دیا جائے ۔ حالانکہ دوسری طرف جب دربارِ فرعون کے ساحرین ایمان لائے ہیں تو اس نے ان ہی کے متعلق حکم دیا تھا کہ انہیں سولی پر لٹکا دیا جائے ۔ نہ یہ کہ ان کے بچوں کو قتل کر دیا جائے ۔

بہر حال، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ۔ قرآنی شواھد سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ ذَبْحِ آبْنَاءَ اور اِسْتِحْيَاءِ نِسَاء کے الفاظ استعارةً استعمال ہوئے ہیں ۔ سچ مچ ذبح کر دینے کے معنوں میں استعمال

نہیں ہوئے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے، یہ ہمارا قیاس ہے جس کے دلائل اوپر دئیے گئے ہیں ۔ اگر ان دلائل کو قوی نہ سمجھا جائے تو ذَبْح اَبْنَاء کو حقیقی معنوں میں لیا جائیگا ۔ یعنی فرعون، بنی اسرائیل کے لڑکوں کو سچ مچ ذبح کر دیا کرتا تھا ۔ اسوقت تک مصر کی قدیم تاریخ سے جسقدر پردے اٹھے ہیں ان میں بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کر دینے کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا ۔ ممکن ہے جب تاریخ کے مزید اوراق سامنے آئیں تو ان میں اس کے متعلق کوئی ذکر ہو ۔ اسوقت تک صرف تورات میں یہ ملتا ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو مار ڈالنے کا حکم دے رکھا تھا (کتاب خروج) لیکن تاریخی نقطہ نگاہ سے موجودہ تورات کی جو حیثیت ہے وہ ارباب علم سے پوشیدہ نہیں ۔

سورۃ مائدہ میں ان جانوروں کو جو بتوں کے استھانوں پر قربانی دئے جاتے تھے مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (۵/۳) کہا ہے ۔

سورۃ صٰفّٰت میں حضرت ابراہیم[ؑ] اور اسمعیل[ؑ] کے تذکار جلیلہ میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم[ؑ] اپنے بیٹے کو (اپنے خیال کے مطابق) ہماری راہ میں قربان کرنے اور حضرت اسماعیل[ؑ] اپنے آپکو اسطرح قربان کر دینے کیلئے تیار ہو گئے تو ہم نے انہیں آواز دیکر اس سے روک دیا اور وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (۳۷/۱۰۷) ۔ ”اسماعیل کو ایک ذبح عظیم کے بدلے میں بچا لیا،، ۔ جیسا کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات سے واضح ہے، اس ذبح عظیم سے مراد یہ ہے کہ انہیں شام کے سر سبز و شاداب علاقہ کی سرداری کی بجائے عرب کی بے برگ و گیاہ سرزمین میں خانۂ کعبہ کی تولیت کیلئے متعین کر دیا ۔ یہ وہ قربانی تھی جو ساری عمر کیلئے تھی ۔ نہ صرف اپنی ساری عمر کے لئے بلکہ اپنی آنے والی نسل کی بھی قربانی ۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ (۳۷/۱۰۸) اسلئے یہ ذبح عظیم تھی ۔ یعنی بہت بڑی قربانی ۔ (مزید تفصیل میری کتاب ”جوئے نور،، میں ملیگی ۔ اور بنی اسرائیل کے حالات ”برق طور،، میں) ۔

ذ خ ر

ذَخَرَ ۔ يَذْخَرُ ۔ کسی چیز کو لے لینا ۔ اپنا لینا ۔ کسی چیز کو اسلئے چھپا رکھنا کہ وہ بوقت ضرورت کام آئے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو محفوظ رکھنے کی غرض سے سمیٹ لینا ۔ اِدَّخَرَ اِدِّخَارًا باب افتعال سے بمعنی ذَخَرَ ہی ہے۔ (اِدِّخَارًا اصل میں

اِذْ تَخْتَارُ تھا) - اَلْمُدَّخِرُ - اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو دوڑنے میں اپنی پوری طاقت خرچ نہ کرے بلکہ کچھ طاقت بچا رکھے* - اَلْاِذْخِرُ فربہ - موٹا** -

سورۃ آل عمران میں ہے مَا تَدَّخِرُوْنَ فِی بُیُوْتِکُمْ (۳/۴۸)- اسکے معنے ذخیرہ کرنے کے ہیں- معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح (خدا کے ایک سچے داعیٔ انقلاب ہونے کی وجہ سے) یہودیوں کی ذخیرہ اندوزی (Hoarding) سے نالاں تھے- اس میں اسی کی طرف اشارہ ہے -

ذ ر أ

ذَرَاَ الْاَرْضَ - زمین میں بیج ڈال دیا* - ذَرَاَ اللّٰہُ الْخَلْقَ - اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا اور اسے بڑھایا - کثیر کر دیا* - چنانچہ قرآن کریم میں ہے - یَذْرَؤُکُمْ فِیْہِ (۴۲/۱۱) - ''وہ اسطرح تمہیں بڑھاتا اور پھیلاتا رہتا ہے'' - سورۃ المومنون میں ہے ھُوَ الَّذِیْ ذَرَاَکُمْ فِی الْاَرْضِ (۲۳/۷۹) - ''وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں بڑھایا اور پھیلایا ہے'' -

ذُرِّیَّۃٌ کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ یہ ذَرَاَ سے مشتق ہے - لیکن بعض کے نزدیک یہ ذَرٌّ سے مشتق ہے - ہم نے اسے (ذ - ر - ر) کے نیچے لکھا ہے -

ذ ر ر

اَلذَّرُّ - بہت چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں - نیز وہ چھوٹے چھوٹے ذرات جو دھوپ میں منتشر نظر آتے ہیں - اَلذَّرُّ کا واحد ذَرَّۃٌ ہے - نہایت چھوٹی اور کم وزن چیز کو بھی اسی جہت سے ذَرَّۃٌ کہا جاتا ہے - سورۃ زلزال میں مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ (۹۹/۷) آیا ہے - ذرہ کے وزن برابر - یعنے خفیف سے خفیف - ذَرَّ - کسی چیز کو چھڑکنا - متفرق کرنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی باریکی اور انتشار ہوتے ہیں - ذَرَّالْمِلْحَ عَلَی اللَّحْمِ - اسنے گوشت پر نمک چھڑکا - ذَرَّالْحَبَّ فِی الْاَرْضِ - اسنے زمین میں بیج بکھیر دیا* -

اَلذُّرِّیَّۃُ - اَلذِّرِّیَّۃُ - آدمی کی اولاد اور نسل، خواہ نر ہو یا مادہ - لیکن کبھی اسکا اطلاق انسان کے والدین اور آبا و اجداد پر بھی ہوتا ہے - یعنی یہ لفظ اضداد میں سے ہے* - (اس کے متعلق ذرا آگے چل کر لکھا جائیگا) -

---

*تاج - **محیط -

راغب نے کہا ہے کہ اسکے اصلی معنے تو چھوٹے بچے ہیں لیکن یہ کبھی چھوٹے اور بڑے سب بچوں پر بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ ہے تو جمع ہی کیلئے لیکن پھر واحد اور جمع سب کیلئے یکساں آتا ہے۔ بعض کے نزدیک ذُرِّيَّةٌ کا مادہ ذرأ ہے۔ جسکے معنے پیدا کرنے اور بڑھانے کے ہیں۔(لین)۔

ذَرَّ الْبَقْلُ۔ سبزی پھوٹی*۔

قرآن کریم میں ذُرِّيَّةٌ بمعنے اولاد اور نسل ($\frac{4}{122}$) میں آیا ہے۔ سورۃ یٰسین میں جہاں کہا ہے کہ اِنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ ($\frac{36}{41}$)۔ ’’ہم نے ان کی ذریت کو کشتی میں سوار کیا‘‘۔ تو وہاں ذریت کے معنے (اس نسل کے) چھوٹے بڑے سب ہیں۔ اس آیت ($\frac{36}{41}$) ہی کی وجہ سے اہل لغت نے الذُّرِّيَّةُ میں اولاد اور آباء کے معنی تسلیم کئے ہیں اور اسی بناء پر یہ لفظ اضداد میں مانا گیا ہے، لیکن قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ کہیں بھی آباء کے لئے نہیں بولا گیا بلکہ آباء کے بالمقابل اولاد کے لئے ہی استعمال ہوا ہے ($\frac{6}{88}$)۔ مذکورۃ الصدر آیت ($\frac{36}{41}$) میں بھی یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ذُرِّيَّةٌ اولاد ہی کے لئے ہے، جبکہ ہم الفُلْكِ الْمَشْحُوْن سے مراد حضرت نوحؑ کی ایک معین کشتی لیں جو وحی کے ذریعہ بنوائی گئی تھی اور ذرِيَّتَهُمْ سے مراد اُس زمانہ کے انسانوں کی نسل لی جائے۔ اس طرح اس لفظ میں متضاد معانی باقی نہیں رہینگے۔

سورۃ یونس میں ہے فَمَا اٰمَنَ لِمُوْسٰى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ ($\frac{10}{83}$)۔ بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنے ہیں بہت تھوڑے لوگوں نے***۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنے ہیں اسکی قوم کے نوجوان****۔ ہمارے نزدیک دوسرے معنے زیادہ واضح ہیں۔ انقلاب آفرین پیغام پر، ابھرنے والی نسلیں جلدی ایمان لاتی ہیں۔ پرانے لوگ اپنے قدیم معتقدات اور عادات و خصائل میں پختہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ نیز بڑھاپے کی وجہ سے ان میں اپنے اندر نئی تبدیلی پیدا کرنے، یا نئے ماحول سے مطابقت، کی ہمت بہت کم ہوتی ہے۔ یہ قوم کا نوجوان طبقہ ہوتا ہے جو ظلم و استبداد کے علی الرغم، کسی قسم کا خوف نہ کرتے ہوئے، دعوت انقلاب پر لبیک کہتا اور حالات کی تلاطم انگیزیوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان ذ۔ب۔ح)۔

*تاج و محیط۔ **راغب۔ ***ابن عباس۔ ****ابو الکلام آزاد مرحوم۔

ذ ر ع

اَلذِّرَاعُ۔ ھاتھ کا کہنی سے لیکر درمیانی انگلی کے آخر تک کا حصہ۔ کلائی کے لئے بھی بولا جاتا ہے ، نیز ایک پیمانہ جس سے ناپا جاتا ہے*۔ سورۃ کہف میں ہے وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ (١٨/١٨)۔ ''ان کا کتا اپنے دونوں ھاتھ (یعنے اگلی ٹانگیں) بچھائے ہوئے تھا،،۔ ذَرْعُهُ كَذَا۔ اسکا طول اسقدر ہے**۔ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا (٦٩/٣٢)۔ ''اسکی پیمائش ستّر ھاتھ ہے،،۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا لمبا ہونا اور آگے کیطرف حرکت کرنا۔ مَالِيْ بِهِ ذَرْعٌ۔ مجھے اسکی دسترس نہیں*۔ ضِقْتُ بِهِ ذَرْعًا۔ کسی کام کی دسترس نہ رکھنا۔ سورۃ ھود میں حضرت لوطؑ کے متعلق ہے ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا۔ (١١/٧٧)۔ اسنے ان کے معاملہ میں اپنے آپکو کوتاہ دست پایا۔

اَلذَّرِيْعَةُ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو شکار کیلئے بطور آڑ استعمال کی جاتی ہے*۔ نیز ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کے توسط سے مقصد تک ھاتھ پہنچ سکے۔

ذ ر و

ذَرَتِ الرِّيْحُ الشَّيْئَ ذَرْوًا۔ ھوا اس چیز کو اڑا کر لے گئی۔ ذَرَا الْحِنْطَةَ يَذْرُوهَا ذَرْوًا۔ اسنے گیہوں کو بھوسے سے صاف کرنے کے لئے ھوا میں اڑایا۔ فَتَذَرَّتْ۔ پس گیہوں بھوسے سے الگ ھو کر صاف ھو گیا۔ ذُرَاوَةُ النَّبْتِ۔ پودے کے جھڑے ہوئے خشک اجزاء جو ھوا میں اڑ جائیں۔

ذُرْوَةُ الشَّيْئِ۔ چیز کا بلند تر اور اونچا حصہ*۔

سورۃ کہف میں ہے تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ (١٨/٤٥)۔ ''ھوائیں اسے اڑائے اڑائے پھرتی ہیں،،۔ سورۃ ذاریات میں ہے۔ وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا۔ (٥١/١)۔ ذَرْوٌ۔ پھیلا دینا۔ بکھیر دینا۔ ذَارٍ (اَلذَّارِيْ) بکھیر دینے والا ، پھیلا دینے والا (نشرو اشاعت کرنے والا)۔ وہ قوتیں جو کسی پیغام (یا نظام) کی نشرو اشاعت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جن سے وہ آواز دنیا میں پھیلتی ہے۔ ذرائع رسل و رسائل و مواصلات و نشرو اشاعت۔

*تاج۔ **محیط۔ *تاج و راغب۔

ذ ع ن

اَذْعَنَ ۔ اطاعت میں جلدی کرنا ۔ دوڑ کر حکم کی تعمیل کرنا ۔ نَاقَةٌ مِذْعَانٌ ۔ مطیع اونٹنی ۔ مُذْعِنِيْنَ (۲۴/۴۹) لپک کر اطاعت کرنے والے* ۔ اَذْعَنَ لَهٗ ۔ اس کے لئے جھکا اور اس کا تابع فرمان ہوا** ۔

صاحب محیط نے اَلْاِذْعَانُ کے اصطلاحی معنے بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ الاِذْعَانُ اعتقاد یعنی دلی عزم کو کہتے ہیں ۔ اور عزم ، تردد کے بعد ارادے کی پختگی کو کہتے ہیں ۔ اذْعَان کے مختلف مراتب ہوتے ہیں جن میں سے ادنیٰ ترین کو ظن اور اعلیٰ ترین کو یقین کہا جاتا ہے ۔ اور ان دونوں کے درمیان تقلید اور جہل مرکب کا مرتبہ ہوتا ہے** ۔

ذ ق ن

اَلذَّقَنُ ۔ ٹھوڑی* ۔ جمع اَذْقَانٌ ۔ (۳۶/۸) ۔ مجازاً چہرے کو بھی کہدیتے ہیں ۔ جیسے يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا (۱۷/۱۰۷) میں منہ کے بل گرنے کیلئے یہ لفظ آیا ہے ۔

ذ ک ر

اَلذِّکْرُ وَالتَّذْكَارُ ۔ کسی چیز کو محفوظ کر لینا ۔ کسی بات کا دل میں حاضر کر لینا ۔ یہ لفظ نَسْيٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۶/۱۸) ۔ نَسْيٌ کے معنے ہوتے ہیں کسی بات کو بھلا دینا ۔ لہذا ذِکْرٌ کے معنے ہوئے کسی بات کو یاد کرنا ۔

اِدَّكَرَ ، اِسْتَذْكَرَ ، تَذَكَّرَ ۔ کے ہم معنے ہیں کسی بات کو یاد کر لینا ۔ لیکن ابواب کے خواص کے لحاظ سے ان کے مفہوم میں لطیف سا فرق ہے ۔ اِدَّكَرَ اصل میں اِذْتَكَرَ ہے ۔ صوتی گرانی کی وجہ سے ذال کو دال کردیا ۔ پھر تاء کو دال میں مدغم کردیا ۔ اسی سے مُدَّكِرٌ اسم فاعل ہے ۔

اَلتَّذْكِرَةُ ۔ جس سے کسی ضرورت کو یاد دلایا جائے ۔ (۲۹/۴۹)

اَلذِّکْرٰی (۶/۹۱) یاد دہانی ۔

ذَكَرَ حَقَّهٗ ۔ اسکے حق کی حفاظت کی اور اسکو ضائع نہیں کیا ۔

اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۔ تم پر جو خدا کے احسانات ہیں انکی حفاظت کرو اور انہیں ضائع مت کرو* ۔

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔

شہرت کو بھی ذِکْرٌ کہتے ہیں - نیز کسی کے متعلق اچھی بات کہنے کو بھی - اور شرف و عزت کو بھی - اور عبرت و موعظت کو بھی - ذِکْرٌ اُس کتاب کو بھی کہتے ہیں جس میں دین کی تفصیلات اور امتوں کے قوانین درج ہوں* -

اَلذَّکَرُ - قوی اور شجاع مرد - تلوار کی تیزی اور سختی کو بھی کہتے ہیں* - نیز نر ، بمقابلہ الاُنْثٰی (۳/۳۵) میں آیا ہے -

مُذَکَّرٌ - مؤنث کی ضد ہے - نیز سخت مصیبت جس کا مقابلہ مرد ہی کر سکیں* -

قرآن کریم کو الذِّکْرُ کہا گیا ہے (۱۶/۴۴) - کیونکہ اسمیں اقوام و ملل کے عروج و زوال کے قوانین بھی ہیں اور تاریخی یاد داشتیں بھی - اشیائے فطرت پر غور و فکر کرنے والوں کو لِقَوْمٍ یَذَّکَّرُوْنَ (۱۶/۱۳) کہا گیا ہے - نیز غیر خدائی قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی کو ذِکْرٌ سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنے ان قوانین خدا وندی کو سامنے لانے کی جد و جہد جنہیں اُنہوں نے پس پشت ڈال رکھا ہے - (۲۰/۳۲ و ۲/۴۴) - اسلئے میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اور اسطرح قوانین خداوندی کو عملاً غالب کرنے کو بھی ذِکْرٌ کہا گیا ہے (۸/۴۵) - اسکے معنے یہ بھی ہیں کہ زندگی کے کسی گوشہ میں ، حتٰی کہ میدان جنگ میں بھی، قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو - انہیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھو - خود قوانین خدا وندی ذِکْرُاللهِ (۳۹/۲۳) ہیں - شرف اور عظمت کے معنوں میں یہ لفظ (۲۳/۲۰) میں آیا ہے - نیز (۴۳/۴۴) میں ، جہاں قرآن کریم کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّهٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَ لِقَوْمِکَ کہ تمہاری اور تمہاری قوم کی عظمت اور بڑائی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ تم قرآن کریم پر عمل پیرا رہو - سورۃ قمر میں مُدَّکِر آیا ہے (۵۴/۱۵) - سورۃ دہر میں جہاں آیا ہے کہ انسان پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا (۷۶/۱) - تو اسمیں مَذْکُوْرًا کے معنے ہیں ایسی چیز جو اپنی ذات سے وجود میں آ گئی ہو اور قائم ہو** - (Existing by Itself) -

سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ (۲/۱۵۲) - اسکے معنے یہ ہیں کہ تم میرے قوانین کو اپنے سامنے رکھو تو میں تمہارے حقوق کی حفاظت کرونگا اور تمہیں عظمت و سطوت عطا کرونگا - تم

*تاج - **لین و تاج -

ان قوانین کا اتباع کرو تو انکے خوشگوار نتائج یقیناً تمہارے سامنے آ جائینگے۔ (یہاں، علاوہ دیگر امور کے یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ ابتدا (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا اسکا جواب دیتا ہے ۔ جس قسم کا عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے اسی قسم کا رد عمل خدا کی طرف سے ہوتا ہے) ۔ لہٰذا ذِکْرُ اللّٰہِ کے معنے قوانین خداوندی کا اتباع ہیں (نہ کہ تسبیح کے دانوں پر اللہ اللہ گنتے رہنا) ۔ اور اس اتباع کا لازمی نتیجہ شرف و عظمت اور غیر خدائی قوتوں پر غلبہ و تسلط ہے ۔ جیسا کہ سابقہ حوالوں میں بتایا جا چکا ہے، صاحب ضرب کلیمی کا فرعون کے مقابلہ کے لئے جانا، ذکر اور تسبیح ہے ۔ (تَسْبِیْح کیلئے دیکھئے س ۔ ب ۔ ح کا عنوان) ۔ میدان جنگ میں ثابت قدم رہنا ذکر ہے ۔ اشیائے کائنات پر غور و فکر کرنا ذکر ہے ۔ اقوام سابقہ کی تاریخ سے عبرت وموعظت حاصل کرنا ذکر ہے ۔ زندگی کے ہر شعبہ میں، ایک ایک قدم پر قانون خداوندی کو سامنے رکھنا اور اس کے مطابق فیصلے کرنا ذکر ہے ۔ ان قوانین کا عام چرچا کرنا بھی ذکر ہے ۔ اسی کو آجکل کی اصطلاح میں نشرو اشاعت کرنا کہتے ہیں ۔ یہی وہ ''ذکر اللہ،، ہے جس سے دلوں کو سچا اطمینان حاصل ہوتا ہے ($\frac{13}{28}$)۔ ہم نے اطمینان کے ساتھ ''سچے،، کی تخصیص اس لئے کی ہے کہ جھوٹا اطمینان انسان کو ہر طریق سے حاصل ہو سکتا ہے ۔ اگر جھوٹا اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو تو لوگ باطل مذاہب پر جمے کسطرح رہیں؟ سچا اطمینان، علیٰ وجہ البصیرت حاصل ہوتا ہے ۔ یعنی جب کسی بات پر علم و بصیرت کی رو سے غور کرنے کے بعد، یا اس کے عملی نتائج سامنے آ جانے کے بعد، ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ وہ بات حق وصداقت پر مبنی ہے، تو اس سے سچا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو دل اور دماغ دونوں کے لئے وجہ سکون ہوتا ہے ۔ جھوٹا اطمینان، اپنے آپ کو فریب دینے سے حاصل ہوتا ہے ۔ سچا اطمینان، جماعت مومنین کو بدر کے میدان میں حاصل ہؤا تھا جب انہیں اپنے سے تین گنا فوج پر عظیم فتح حاصل ہوئی تھی ($\frac{3}{125}$) ۔ یہ حجروں اور خانقاہوں میں حاصل نہیں ہوتا ۔

ذ ک و

ذَکَاءٌ ۔ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کا مکمل ہو جانا ۔ خلیل نے کہا ہے کہ اَلذَّکَاءُ فِی السِّنِّ ۔ عمر کے پختہ ہو جانے کو کہتے ہیں جب انسان کی قوتیں کمال تک پہنچ جاتی ہیں ۔ اسی اعتبار سے اَلذَّکَاءُ ذہانت اور فطانت کی تیزی اور تکمیل کو کہتے ہیں ۔ ذَکِیٌّ ۔ تیز فہم ۔

بڑا ذہین - ذَکَتِ النَّارُ - آگ بھڑک اٹھی * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تیزی اور نفوذ کے ہوتے ہیں -

اَلتَّذْکِیَۃُ کے معنے جانور کو ذبح کر دینے کے ہوتے ہیں - راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنے حرارت غریزی نکال دینے کے ہوتے ہیں * - (ذَکَتِ النَّارُ کی جہت سے) - باب تفعیل کا ایک خاصہ سلب ماخذ ہوتا ہے - یہ اسکی مثال ہے - یعنی ذَکَاءٌ کے معنی حرارت - اور ذکّی کے معنی حرارت نکال لی - سلب کر لی - اسی کو سلب ماخذ کہتے ہیں - یعنی لفظ کے مادہ کی جو خصوصیت ہو اسے سلب کر لینا - قرآن کریم میں ہے اِلَّا مَاذَکَّیْتُمْ (۵/۳) - " بجز اسکے جسے تم ذبح کر لو " -

ذ ل ل

ذِلَّۃٌ - ذَلَالَۃٌ کے معنی ہیں کسی کی سختی اور منہ زوری کا ٹوٹ جانا اور اسکا مطیع و فرمانبردار ہو جانا - راغب نے اَلذُّلّ - زور و قہر کی وجہ سے جھکنے کو کہا ہے اور اَلذِّلّ اس جھکنے کو کہتے ہیں جس میں طبیعت کی تیزی و سختی ازخود مغلوب ہو جائے - اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب ذُلّ کسی غیر کے دباؤ اور جبر سے نہ ہو تو یہ مذموم صفت نہیں رہتی - ذَلُوْلٌ - (جمع ذُلُلٌ) جو تابع فرمان ہو جائے اور منہ زور نہ رہے * - سورۃ بقرہ میں ہے اِنَّھَا بَقَرَۃٌ لَّاذَلُوْلٌ (۲/۷۱) " وہ سانڈ ہے جسے ہل میں نہیں جوتا گیا " - عَیْرٌ المُذَلَّلَۃِ اس گدھے کو کہتے ہیں جس کے اوپر بوجھ لدا ہو اور پیچھے سے لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہو ** - اس سے ذِلَّت کا صحیح نقشہ سامنے آجاتا ہے -

ذُلِّلَ الْکَرْمُ تَذْلِیْلًا کے معنی ہیں انگور کے خوشے نیچے جھکا دیئے گئے * -

قرآن کریم میں تَذِلُّ ، تُعِزُّ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳/۲۶) - اور وہیں ان دونوں لفظوں کا مفہوم بھی بیان کر دیا گیا ہے - یعنی عِزَّت کے معنے ہیں حکومت اور مملکت مل جانا - غلبہ و اقتدار حاصل ہو جانا - اور ذِلَّت کے معنے حکومت و مملکت کا چھن جانا - غلبہ و اقتدار کا کھو جانا - سورۃ یٰسٓ میں مویشیوں کے متعلق ہے فَھُمْ لَھَا مَالِکُوْنَ - وَذَلَّلْنٰھَا (۳۶/۷۱-۷۲) - انسانوں کو ان پر غلبہ و اقتدار حاصل ہے - انہیں انسانوں کا مطیع

* تاج - ** محیط -

و فرمانبردار بنا دیا ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں نَذِلَّ وَنَخْزٰی (۲۰/۱۳۴)۔ ذلت و رسوائی کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں۔ میدان جنگ میں کمزوری کیلئے یہ لفظ (۳/۱۲۲) میں آیا ہے۔ سورۃ مائدہ میں جماعت مومنین کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ (۵/۵۴)۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ یہاں اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کے معنے رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) ہیں۔ یعنے ایک دوسرے کے ساتھ مشفق و ہمدرد۔ اور مخالفین کے مقابلہ میں سخت۔ جَنَاحَ الذُّلِّ (۱۷/۲۴) نرمی تواضع اور مہربانی کے لئے آیا ہے۔

قرآن کریم نے ذلت و مسکنت، محکومی اور کمزوری کی زندگی کو خدا کا غضب قرار دیا ہے۔ (۲/۶۱)۔ یہ ذلت اسی دنیا کی ذلت ہے جو ہر ایک کو نظر آسکتی ہے (۷/۱۵۲)۔ اسکے برعکس کہا ہے کہ مومنین کی زندگی غلبہ و اقتدار اور قوت و سطوت کی زندگی ہے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (۶۳/۸)۔ ’’ غلبہ و اقتدار اللہ اور اس کے رسولؐ اور جماعت مومنین کے لئے ہے ‘‘۔ مومنین کی زندگی اَعْلَوْنَ (۳/۱۳۸)۔ سب پر غالب رہنے کی زندگی ہے۔ حکومت اور سلطنت کی زندگی ہے (۲۴/۵۵)۔ لہذا جس زندگی میں غلبہ و اقتدار اور شوکت و حشمت نہیں وہ مومنین کی زندگی نہیں۔ اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی خدا کا عذاب ہے۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۲/۶۱) ’’ ان پر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی۔ یعنی وہ عذاب خداوندی کے مستوجب بن گئے ‘‘۔ اس دنیا کو اغیار کے حوالے کرکے، بیکسی و بے بسی، محتاجی اور محرومی کی ذلیل زندگی بسر کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس سے انسان کو ’’ روحانی ترقی ‘‘ حاصل ہوتی ہے، وہ فریب ہے جو مستبد قوتیں کمزوروں اور محکوموں کو دیتی ہیں۔ قرآن کریم اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس نے کھلے الفاظ میں کہا کہ اس دنیا میں عزت و اقتدار سرفرازی و سربلندی۔ شوکت و حشمت۔ دولت و قوت۔ حکومت و سطوت کی زندگی، ایمان و اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ ہے۔ اور ذلت و خواری، محکومی و محتاجی کی زندگی خدا کا عذاب۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ جو یہاں خدا کے عذاب میں مبتلا ہے وہ عاقبت میں خدا کا مقرب نہیں ہو سکتا۔ جس کا حال تاریک ہے اس کا مستقبل بھی تاریک ہوگا۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)۔ ’’ جو ہمارے قانون سے اعراض برتیگا تو اسکی روزی تنگ ہو جائیگی اور ہم

* تاج۔ ** محیط۔

اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھائینگے''۔ یہ ایک ایسا معیار ہے جس سے ہم ہر وقت اپنے اعمال کو پرکھ سکتے ہیں۔

ذ م م

ذَمَّهٗ۔ یَذُمُّهٗ۔ ذَمًّا۔ مَذَمَّةً۔ مَدْحٌ کی ضد ہے۔ برائی کرنا۔ اِسْتَذَمَّ۔ اسنے قابل مذمت کام کیا۔ بِہٖ ذَمِیْمَةٌ۔ اسے کوئی ایسا عارضہ یا آفت لاحق ہے جسکی وجہ سے وہ باہر نہیں نکل سکتا*۔ مَذْمُوْمٌ (۱۸/۱۹) میں انہی معانی میں آیا ہے۔

ذِمَّةٌ۔ ہر وہ ذمہ داری۔ معاہدہ۔ قول و قرار جسکے ضائع کر دینے سے مذمت لازم آتی ہو**۔ جس عہد وغیرہ کے توڑ دینے پر انسان کی مذمت کی جاتی ہو***۔

اَلذِّمَّةُ۔ امان۔ کفالت۔ ضمانت۔ ذِمِّیٌّ۔ وہ آدمی جسے عہد حاصل ہو۔ جس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لی گئی ہو۔ جسے ہر طرح کی ضمانت دیدی گئی ہو۔ قرآن کریم میں ہے لَا یَرْقُبُوْا فِیْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹/۸) ''یہ کسی حق اور حرمت۔ عہد و پیمان کا خیال نہیں کرتے،،۔ (اسکی تشریح کیلئے عنوان ا ل ل دیکھئے)۔

ذ ن ب

اَلذَّنَبُ۔ دُم۔ ذَنَبَهٗ۔ وہ اسکے (دُم کے) پیچھے پیچھے رہا۔ مُسْتَذْنِبٌ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو اونٹوں کی دموں کے پیچھے پیچھے رہے۔ اَلذِّنَابُ۔ ہر چیز کا پچھلا حصہ نیز اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کی دم کو کجاوہ سے باندھ دیا جائے۔ اس جہت سے اس مادہ کے معنوں میں کسی چیز کے آخری حصہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ذِنَبَةُ الْوَادِیْ۔ وادی کے آخری حصہ کو کہتے ہیں۔ اور اَلذُّنَابَةُ پیچھے لگنے والے کو۔ انہی معانی کے پیش نظر راغب نے لکھا ہے کہ اَلذَّنْبُ دراصل کسی چیز کے پچھلے حصے یا دم کے پکڑنے کو کہتے ہیں۔ نیز ہر اس کام کو جس کا انجام برا ہو۔ نیز کسی کام کے نتیجہ (انجام) کو بھی ذَنْبٌ کہتے ہیں**۔ اس اعتبار سے یہ لفظ جرم اور معصیت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ (۹۱/۱۴) میں اسکے معنے جرائم کے ہیں۔ یعنی ان کے رب نے ان کے جرائم کی وجہ سے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ نیز ذَنَبٌ۔ خسیس چیز اور رذیل اور کمینہ کو بھی کہتے ہیں*۔

---

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

چونکہ دُم ہمیشہ جانور کے پیچھے لگی رہتی ہے اسلئے ان اتہامات کو بھی ذُنُوبٌ کہا جا سکتا ہے جو یونہی کسی کے پیچھے چپکا دئے جائیں ۔ (جسطرح اَلْقِفْوَةُ دُم کو کہتے ہیں لیکن اس کے معنی تہمت کے بھی ہیں ۔ دیکھئے عنوان ق ۔ ف ۔ و) ۔ چنانچہ سورۃ فتح میں جہاں نبی اکرمؐ کے متعلق کہا ہے لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (۴۸/۲)۔ تو اسکے معنے یہ ہیں کہ یہ فتح عظیم اسلئے دی جا رہی ہے کہ ان تمام اتہامات سے تمہاری حفاظت ہو جائے جو تمہارے مخالفین تم پر لگاتے رہے ہیں یا آئندہ لگانا چاہیں ۔ مخالفین کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) آپ اپنے دعاوی میں جھوٹے ہیں ۔ دیوانے ہیں ۔ کسی نے ان پر جادو کر دیا ہے ۔ یونہی لوگوں کو سبز باغ دکھا کر ورغلاتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ فتح مبین، جس سے مخالفین کی قوتیں ٹوٹ گئی ہیں، ان تمام اتہامات کا جواب ہے کہ دیکھ لو انجام کار کون سچا ثابت ہوا ۔ (نیز دیکھئے عنوان ق ۔ د ۔ م)۔

ذَنُوبٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جسکی دُم کے بال گھنے ہوں اور وہ بالوں سے بھری ہوئی ہو ۔ نیز اس بڑے ڈول کو بھی کہتے ہیں جس میں پانی بھرا ہوا ہو۔ (اگر وہ خالی ہو تو اُسے دَلْوٌ کہا جائیگا) ۔ نیز ایسے دن کو بھی کہتے ہیں جس کا شر بہت طویل ہو جائے، اتنا طویل کہ ختم ہوتا نظر نہ آتا ہو۔

سورۃ ذاریات میں ہے فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ (۵۱/۵۹) ۔ تاج ، محیط اور راغب نے کہا ہے کہ ذَنُوبٌ کے معنی نصیبہ یا حصہ کے ہیں ۔ اس اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ ظلم کر رہے ہیں ان کا نصیبہ بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ان لوگوں کا نصیبہ تھا جو ان کی مثل تھے ۔

بعض لوگ اپنے آپ کو، ازرہ کسر نفسی، مُذْنِب (عاصی پُر معاصی وغیرہ) کے لقب سے یاد کرتے ہیں ۔ ذنب یا گناہ، حکومت خدا وندی کے جرم کو کہتے ہیں ۔ جب ہم اپنے آپ کو ''مجرم،، کہنا پسند نہیں کرتے تو مذنب یا عاصی وغیرہ کیوں کہلوائیں؟ اگر ہم سے واقعی کوئی جرم صادر ہو گیا ہے تو اس پر ہمیں ندامت ہونی چاہئے ، نہ کہ اسے اپنے لئے نشان امتیاز یا پہچانے جانے کی علامت قرار دیدیا جائے ۔

ذ ھ ب

ذَھَاب* کے معنے ھیں چلا جانا ۔ گزر جانا ۔ ذَھَبَ بِہٖ کے معنے ھیں لے جانا ۔ ذَھَبَ عَلَیَّ کَذَا کے معنے ھیں، میں فلاں بات کو بھول گیا ۔ اگر ذَھَبَ کے ساتھ عَنْ آئے تو اسکے معنے چھوڑ دینے کے ھوتے ھیں ۔ اور اگر اسکے ساتھ اِلٰی آئے تو اسکے معنے متوجہ ھو جانے کے آتے ھیں* ۔ صاحب کشاف نے کہا ھے کہ اَذْھَبَہٗ کے معنے ھیں اسکو زائل کر دیا ۔ دور کر دیا ۔ لے گیا ۔ (۳۳/۳۶) ۔ اور ذَھَبَ بِہٖ کے معنے ھیں اسکو اپنے ساتھ لے گیا ۔ یعنے خود بھی اسکے ساتھ چلا گیا** ۔ لیکن قرآن کریم میں جہاں آیا ھے ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ (۲/۱۷) تو اسکے معنے لے جانے کے ھیں۔ ساتھ چلے جانے کے نہیں ۔ اَلْمَذْھَبُ ۔ جانا ، جانے کی جگہ، راستہ، طریقہ، وہ عقیدہ جس کی طرف کسی کا رجحان ھو۔نیز بیت الخلاء کو بھی کہتے ھیں جہاں قضائے حاجت کیلئے جائیں* ۔ لیکن قرآن کریم میں مَذْھَب کا لفظ کہیں نہیں آیا ۔ اسلام کیلئے دِیْن کا لفظ آیا ھے ۔ در حقیقت مذھب کے معنے مکتب فکر (School of Thought) کے ھیں ۔ ابتدائے اسلام میں صرف دِیْن تھا ۔ بعد میں جب مختلف ائمہ فکر و فقہ کی نسبتوں سے مختلف طریقے پیدا ھوئے تو دِیْن کی جگہ مَذْھَب (طریقہ) نے لے لی ۔ چنانچہ ذَھَبَ فِی الدِّیْنِ مَذْھَبًا کے معنے ھیں اس نے دین کے بارے میں فلاں عقیدہ اختیار کیا ۔ اور فُلَانٌ یَذْھَبُ اِلٰی قَوْلِ اَبِی حَنِیْفَۃَ کے معنے ھیں فلاں شخص امام ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق چلتا ھے*** ۔ اس سے دِیْن (یعنے وہ ضابطۂ حیات جو خدا کی طرف سے ملا تھا) گم ھو گیا اور مختلف شخصیتوں کی طرف منسوب کردہ مَذَاھِب آگے چل پڑے ۔ جبتک اشخاص کی طرف منسوب کردہ مَذَاھِب نہیں مٹتے دِیْن قائم نہیں ھو سکتا ۔ ”مٹنے،، کے معنے یہ ھیں کہ ان چیزوں کو صرف یہ حیثیت دی جائے کہ یہ اُن حضرات کا دین کے متعلق فہم تھا ۔ یا وہ جزئیات تھیں جنھیں انہوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین کیا تھا ۔ انکی حیثیت ابدی نہیں ھے۔ ابدی صرف خدا کا دین ھے جو قرآن کریم کے اندر ھے ۔ لہذا، اسلاف کے مختلف مذاھب کے نام سے جو کچھ ھمارے پاس چلا آ رہا ھے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھنا چاھئے۔ جس بات کو قرآن کریم صحیح کہے وہ صحیح سمجھی جائے ۔ جسے وہ غلط قرار دے اُسے غلط ٹھہرایا جائے ۔ باقی

*تاج ۔ **محیط ۔ ***لین ۔

رھیں فقہی جزئیات ، تو ان کی حیثیت دائمی ھو ھی نہیں سکتی - ھر دور کی فقہ قرآن کریم کے ابدی اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب ھوگی -

مغرب میں چونکہ عیسائیت ایک (Religion) کی حیثیت رکھتی تھی اسلئے وھاں مذھبِ اسلام کا ترجمہ (Religion of Islam) ھو گیا اور اس سے دین کا تصور بالکل مٹ گیا ، اور اسلام بھی دیگر مذاھب عالم میں سے ایک مذھب سمجھا جانے لگا - حالانکہ اسلام، دین* (ضابطۂ حیات) کا نام تھا - مذھب (Religion) نہیں تھا -

لفظ (Religion) کے بنیادی معنوں کے متعلق علمائے لغت میں اختلاف ھے لیکن اس پر عمومی اجماع ھے کہ اسکے اصلی معنے ''دیوتاؤں کی تعظیم،، کے ھیں - اسکے بعد کسی مافوق الفطرت ھستی کی پرستش کے قواعد و ضوابط کے مجموعہ کا نام ریلیجن رکھا گیا اور ان ھی معنوں میں یہ لفظ بالعموم رائج ھے (دیکھئے Century Dictionary) - ظاھر ھے کہ اسلام اس معنے میں ریلیجن نہیں - یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات یا زندگی کا قانون ھے - لہذا اسلام کو ریلیجن یا مذھب نہیں کہنا چاھئے - یہ دین* ھے -

''مذھب،، درحقیقت اُس زمانے کی یادگار ھے جب ذھن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا - وہ اسوقت یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کائنات میں فطرت کے جو حوادث رو نما ھوتے ھیں، وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ھوتے ھیں - وہ چونکہ ان کی علت (Cause) کو نہیں سمجھتا تھا اس لئے ان سے ڈرتا اور لرزتا تھا اور خوشامد سے انہیں راضی کرنے کے لئے ان کے سامنے جھکتا اور گڑگڑاتا تھا - ان تک اپنی درخواست پہنچانے کے لئے وسیلے تلاش کرتا تھا - سفارش کرنے والے ڈھونڈتا تھا - انسان کی اپنی تو ھم پرستیوں نے دیوی، دیوتاؤں کی تخلیق کی اور اسی سے ان کی بھکتی یا پرستش کا جذبہ پیدا ھؤا - ان میں جو لوگ ذرا زیادہ سمجھدار تھے انہوں نے عوام کی اس سادہ لوحی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو ان دیوتاؤں کے نمائندے یا مقرب بنا کر اپنی پرستش شروع کرا دی - اسطرح مذھبی پیشوائیت اور روحانی اقتدار کے ادارے وجود میں آ گئے - حکمران طبقہ نے ان ''خدائی نمائندگان،، سے گٹھ جوڑ پیدا کیا توانہوں نے انہیں ''ایشورکا اوتار،، - ''ظل اللہ علی الارض،، - اور خدائی اختیارات کا حامل قرار دیکر، عوام کو ان کے حضور جھکنا سکھایا - ان تمام تصورات کے مجموعہ کا نام ''مذھب،، (Religion) ھے جو انسانوں میں اب تک متوارث چلا آ رھا ھے -

مذھب کے اس باطل تصور کو مٹانے کے لئے، خدا کی طرف سے، بوساطت حضرات انبیاء کرام دین ملتا رھا ۔ اس نے انسان کو، کائنات میں، اس کے صحیح مقام سے شناسا کرایا ۔ اس نے کہا کہ کائنات کا سلسلہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرم عمل ھے اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ھے ۔ انسان کا کام یہ ھے کہ ان قوانین کی رو سے کائنات کی قوتوں کو مسخر کرے اور انہیں نوع انسان کی نشو و نما اور بہبود و ترفع کے لئے استعمال کرے۔ اس نے (دین نے) اپنی دعاوی کو دلائل و براھین کی رو سے پیش کیا اور علم و بصیرت کی رو سے ماننے کی دعوت دی ۔ خدا کا یہ دین، اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ھے اور ”مذھب،، کے خلاف کھلا ھؤا چیلنج ھے ۔ دنیا میں چونکہ علم و بصیرت عام ھو رھا ھے اس لئے آھستہ آھستہ مذھب کا دور دورہ بھی ختم ھو رھا ھے ۔ اسطرح دین کے قیام کے لئے راستہ صاف ھو رھا ھے ۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ دنیا کسطرح ملوکیت ۔ سرمایہ داری ۔ مذھبی پیشوائیت سے بیزار ھوتی چلی جا رھی ھے؟ یہی قرائن بتا رھے ھیں کہ اب وہ دور آ رھا ھے جب خدا کا دین، اپنی تابانیوں کے ساتھ عالمتاب ھوگا ۔ اب انسان سن شعور کو پہنچ رھا ھے ۔ اب اسے نہ بچپن کی توھم پرستیاں ڈرا سکتی ھیں ، نہ کاغذ کے پھول بہلا سکتے ھیں ۔ اب اس کا اطمینان زندگی کی ٹھوس حقیقتوں ھی سے ھو سکتا ھے اور وہ قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتیں ۔

اَلذَّھَبُ ۔ (۱۸/۳۱) اس سونے کو کہتے ھیں جو کان سے نکال کر صاف کر لیا گیا ھو ۔ (جو ابھی کان میں ھو اور گلا کر صاف نہ کیا گیا ھو اسے تِبْرٌ کہتے ھیں) ۔ جس چیز پر سونے کا ملمع کیا گیا ھو یا سونے کا پترہ چڑھایا گیا ھو اسے مُذَھَّبٌ کہتے ھیں ۔ ذَھِبَ الرَّجُلُ ۔ اس وقت کہتے ھیں جب کوئی شخص ایک دم کان میں بہت سا سونا دیکھے اور اسے دیکھکر سراسیمہ و مبہوت ھو جائے ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) چلے جانے اور (۲) حسن و تازگی کے ھیں ۔ سونے کو ذَھَبٌ ان دوسرے معانی کی جہت سے کہتے ھیں ۔ اَلْذِّھْبَۃُ ۔ ھلکی سی بارش یا سخاوت کو کہتے ھیں* ۔

ذ ھ ل

ذَھَلَہٗ ۔ ذَھَلَ عَنْہُ ۔ کسی چیز سے ربط و ضبط رکھنے کے باوجود اسے چھوڑ دینا ۔ یا جانتے بوجھتے چھوڑ دینا ۔ یا کسی شغل میں منہمک ھو

*تاج ۔

جانے کی وجہ سے بھول جانا ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ذُھُوْلٌ کے معنے ہیں محبوب چیز کی یاد باقی نہ رہنا اور اس کی عدم موجودگی کے باوجود دل کا خوش رہنا اور کسی قسم کی کمی محسوس نہ کرنا* ۔ صاحب محیطؔ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ذُھُوْلٌ کسی دہشت کی وجہ سے محبوب کو چھوڑ دینا ہے ۔ ذَھِلَ ۔ ہوش و حواس جاتے رہنا** ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں گھبراہٹ اور پریشانی وغیرہ کی وجہ سے کسی چیز سے غافل ہو جانا ۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں انقلاب کے متعلق کہا ہے کہ یَوْمَ تَرَوْنَھَا تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَۃٍ عَمَّا اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَھَا (۲۲/۲) ۔ ''جب تم اسے دیکھو گے اس وقت ہر دودھ پلانے والی اپنے بچہ کو چھوڑ دے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دیگی'' ۔ یہ چیز اس انقلابی ساعت کی ہولناکی کے لئے کہی گئی ہے ۔ لیکن اگر اس سے مراد خود انقلابی دور ہو تو اس سے ہمارا زمانہ سامنے آ جاتا ہے جس میں مائیں بچوں کو دودھ نہیں پلاتیں اور کوئی لڑکی (شادی کے باوجود) حاملہ ہونا نہیں چاہتی ۔ اور ان فطری نسوانی فرائض کو چھوڑ کر انہیں کچھ افسوس نہیں ہوتا بلکہ اس سے خوش ہوتی ہیں ۔ اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ان کے دوسرے مشاغل میں حارج نہ ہوں ۔ ذَھَلَ میں یہ تمام معانی آ جاتے ہیں ۔ یا ویسے ہی پریشانی اور اضطراب کا وہ عالم جس میں ہم سب گرفتار رہتے ہیں اور اسطرح اپنی ضروری ذمہ داریوں تک سے غافل ہوجاتے ہیں ۔

ذ و

ذُوْ ۔ صاحب، والا (جیسے ہم، صاحب اولاد یا عقل و فکر والا ، کہتے ہیں) ۔ اسکی جمع ذَوُوْنَ اور ذَوِیْنَ نیز اُولُوْ آتی ہے ۔ مونث ذَاتٌ ۔ تثنیہ ذَوَاتَانِ ۔ جمع ذَوَاتٌ ۔ قاعدے کی رو سے ذُوْ کبھی ذِیْ اور کبھی ذا ہو جاتا ہے ۔ ذُوْعُسْرَۃٍ ۔ (۲/۲۸۰) ۔ صاحب عسرت ۔ جو تنگدستی میں پڑا ہو ۔ فَذُوْ دُعَاءٍ عَرِیْضٍ (۴۱/۵۱) ۔ لمبی چوڑی دعائیں مانگنے والا ۔ ذَوِی الْقُرْبٰی (۲/۱۷۷) ۔ رشتے دار ۔ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ (۱۸/۱۸) دائیں اور بائیں طرف ۔ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۔ (۳/۱۵۳) دلوں کے اندر کی باتیں ۔ یعنی جو کچھ دل کے اندر ہے ۔

ذَوَاتَا اَفْنَانٍ (۵۵/۴۸) ۔ مختلف علوم و فنون والے ۔

* تاج ۔ **محیط ۔

ذوالقرنین

ایران کا وہ خدا ترس بادشاہ جس نے یہودیوں کو بابل کی اسیری سے رہائی دلا کر یروشلم میں دوبارہ آباد کرایا تھا۔ قرآن کریم نے (سورۂ کہف میں) اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے (۱۸/۸۳-۱۰۱) (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ق۔ ر۔ ن)۔

ذ و د

اَلذَّوْدُ۔ ہانکنا۔ دفع کرنا۔ جھڑک کر نکالدینا۔ ہٹادینا۔ اَلْمِذْوَدُ۔ وہ جگہ جہاں جانوروں کو چارہ ڈالا جاتا ہے۔ بیل کے سینگ جس سے وہ اپنی مدافعت کرتا ہے، یعنے جس سے وہ دوسروں کو ہٹا کر دور رکھتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو دوسری چیز سے الگ اور یک سو کردینا۔

سورۂ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ مدین پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک پیاؤ (گھاٹ) پر دوسرے لوگوں کے جانور (بعد میں آ کر) پانی پیتے چلے جاتے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جو اپنے جانوروں کو روکے کھڑی ہیں (تَذُوْدَانِ ۲۸/۲۳) کہ وہ کہیں آگے بڑھ کر پانی تک نہ پہنچ جائیں۔ اس نقشے کو پھر سامنے لائیے کہ پیاسے جانور پانی کی طرف بڑھنا چاہیں اور ان کا چرواہا انہیں ادھر جانے سے روکے۔ اسے اَلذَّوْدُ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کو اس پر تعجب ہوا کہ وہ لڑکیاں اپنے جانوروں کو پانی کی طرف آنے سے روک کیوں رہی ہیں۔ انہوں نے ان سے پوچھا تو لڑکیوں نے کہا کہ لَا نَسْقِیْ حَتّٰی یُصْدِرَ الرِّعَاءُ (۲۸/۲۳)۔ ہم اپنے جانوروں کو اس وقت تک پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ (طاقتور چرواہے) اپنے اپنے جانوروں کو اچھی طرح پانی پلا کر واپس نہ لے جائیں۔ اسکے ساتھ ہی اسکی وجہ بھی بتائی کہ وَاَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ (۲۸/۲۳)۔ (ہم لڑکیاں ہونے کی وجہ سے کمزور ہیں) اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ اسلئے ہم کب جرأت کرسکتی ہیں کہ ہمارے جانور پہلے پانی پی لیں۔

غور کیجئے۔ قرآن کریم نے ایک کہانی کے دو ٹکڑوں میں نوع انسانی کی پوری کی پوری داستان کس حسن و خوبی سے بیان کرکے رکھدی ہے۔ دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہو رہا ہے کہ طاقتور کا جانور پہلے پانی پیتا ہے اور اس سے اگر کچھ بچ جائے تو غریب کے جانور کی باری

* تاج۔ محیط۔ راغب۔

آتی ہے ۔ اسمیں استثناء ہے تو اُنہی کی جو آسمانی انقلاب کا پیغام لیکرآتے ہیں ۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ کمزوروں کے جانوروں کو انکی باری پر پانی پلانے کا انتظام کریں ۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے ۔ فَسَقٰی لَهُمَا (۲۸/۲۴) (بلا مزد و معاوضہ) ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا ۔ پیغمبر یہی کچھ کرنے کے لئے آتے تھے ۔ اور ان کا لایا ہوا نظام دنیا میں یہی کچھ کریگا ۔ یعنی رزق کے جن سرچشموں پر ارباب اقتدار اپنا قبضہ جمائے ہوں انہیں نوع انسانی کے مفاد عامہ کے لئے آزاد کرا دینا تاکہ ہر فرزند آدم کی ضروریات یکساں طور پر پوری ہوتی رہیں ۔ اگرچہ حضرت موسیٰؑ اسوقت ابھی منصب نبوت پر سرفراز نہیں ہوئے تھے لیکن طبیعت کا رجحان ایسے ہی کاموں کی طرف تھا ۔

ذ و ق

ذَاقَ ۔ چکھنا ۔ مزہ معلوم کرنا* ۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ در اصل تھوڑی سی چیز کھانے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو کھا کر اسکی اندرونی حالت کو معلوم کرنا ہیں ۔ یہ اسکے اصلی معنے ہیں ۔ پھر اسکا اطلاق ہر تجربہ پر ہونے لگا** ۔ یعنے کسی چیز کا تجربہ ہو جانا ۔ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ (۷/۲۲) ۔ جب انہیں "شجرہ" کا تجربہ ہوگیا ۔

ذَائِقٌ ۔ چکھنے والا ۔ جو تجربہ حاصل کرے (۳/۱۸۴) ۔ (مؤنث ذَائِقَةٌ) ۔

اَذَاقَ ۔ مزہ چکھانا ۔ تجربہ حاصل کرانا (۱۶/۱۱۲) ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ بالعموم عذاب کے ساتھ آیا ہے (اگرچہ بعض مقامات پر رَحْمَةٌ کے ساتھ بھی آیا ہے) ۔ اسکے معنے یہ ہیں کہ انسان اپنے اعمال کے نتائج کو اسطرح محسوس کرے گویا اس نے ان کا مزہ چکھ لیا ہے ۔ اسے اسکا عملی تجربہ ہو جائے کہ فلاں کام کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ۔

ذ ی ع

ذَاعَ ۔ يَذِيعُ ۔ پھیل جانا ۔ ظاہر ہو جانا ۔ عام ہو جانا ۔ اَذَاعَ سِرَّهٗ ۔ اسنے اسکے راز کو افشا کر دیا ۔ ظاہر کر دیا ۔ اور لوگوں میں مشہور کر دیا ۔ زجاج نے کہا ہے کہ اسکے معنے لوگوں میں پکار کر کہدینا اور اعلان کر دینا ہیں*** ۔ (۴/۸۳) میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۔ "جب ان تک کوئی امن یا خوف کی بات پہنچتی ہے تو یہ اسے خوب پھیلاتے اور اڑاتے ہیں" ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و محیط ۔